جمہوری ادب

خرم علی شفیق

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اقبالیات کے مارچ-جون ۲۰۰۸ء کے شمارے میں صفحہ ۱۰۹ پر اپنے مضمون 'پاکستان میں اقبالیاتی ادب' میں سلیم احمد کی کتاب اقبال: ایک شاعر کے حوالے سے یہ سوال اٹھایا ہے:

> سلیم احمد کے ان سوالات کا تشفی بخش جواب سامنے نہیں آ سکا کہ ہمارے شعرا کے تخلیقی وجدان نے اقبال کے اثرات کیوں قبول نہیں کیے؟ اور ہمارے اہم ترین نقادوں (عسکری، مجنوں، فراق وغیرہ) نے اقبال سے خاطر خواہ اعتنا کیوں نہیں کیا؟

میرے خیال میں یہ سوال بہت سے ذہنوں میں ہوگا۔ خود میں نے اس پر کئی برس غور کیا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس سوال کے پیچھے جو مفروضے ہیں اُن پر بھی غور کرنا چاہیے یعنی (۱) کیا واقعی ہمارے شاعروں کے تخلیقی وجدان نے اقبال کے اثرات قبول نہیں کیے؟ (۲) کیا حسن عسکری، مجنوں اور فراق وغیرہ ہمارے اہم ترین نقاد تھے؟

مجھے ان دونوں باتوں میں اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کیونکہ:

ہم تا بہ اَبد سعی و تغیّر کے وَلی ہیں
ہم مصطفوی، مصطفوی، مصطفوی ہیں

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ جمیل الدین عالی کی یہ شعری تخلیق ۱۹۷۴ء کی اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر خاص و عام کی زبان پر آئی۔ اسے قبولِ عام کی سند حاصل ہے۔ اقبال کی فکر کے ساتھ اس کا گہرا تعلق یوں بنتا ہے کہ اقبال کی آخری طویل نظم 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' (۱۹۳۶ء) میں ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا تھا کہ مسلمانوں کو الٰہیات میں اُلجھا کر مزاجِ خانقاہی میں پختہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد کی اردو شاعری میں یہ ابلیس کے اعلان کا غالباً سب سے بلند بانگ جواب اور براہِ راست جواب ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارے نقاد اس بارے میں اور ایسی ہی سیکڑوں دیگر تخلیقات کے بارے میں خاموش رہے جو

معیار میں بھی کم نہیں اور جنھیں قبولِ عام کی سند بھی حاصل ہے؟ کیا ایسی چیزوں کے ہوتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''ہمارے'' شاعروں کے تخلیقی وجدان نے اقبال کا اثر قبول نہیں کیا؟

ادبِ عالیہ میں جو تنقید مروج ہے وہ مجھے اس قسم کی تخلیقات کے ساتھ انصاف کرتی نظر نہیں آتی تھی لہٰذا مجھے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا کہ ادب کو مغربی کسوٹیوں کی بجائے تین بنیادی اسالیب یعنی ایمان، کفر و الحاد اور نفاق کے لحاظ سے تقسیم کر کے دیکھا جائے۔ اب ایک بہت ہی عجیب و غریب بات سامنے آئی۔ معلوم ہوا کہ ۱۹۳۶ء کے بعد ہمارے ادبِ عالیہ پر مومنانہ اسلوب کے دروازے بند ہو گئے اور صرف بقیہ دونوں اسالیب کو ادب عالیہ میں شامل سمجھا گیا!

مومنانہ اسلوب کے تحت وہ ادب رکھا جا سکتا ہے جس میں مصنف اپنے سامع یا قاری کو خیر کی طرف بلاتا ہے یعنی اُس چیز کی طرف جسے وہ اپنی زبان سے خیر کہہ رہا ہو۔ ضروری نہیں کہ وہ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی نیکی ہو کیونکہ ممکن ہے کہ جو بات مصنف کی نظر میں خیر ہو وہ علمائے کرام کی نظر میں نہ ہو۔ بہرحال اپنے اسلوب کی حد تک مصنف اپنے اور قاری کے تعلق کو خیر کی دعوت پر قائم کرتا ہے۔ اس کی تین مثالیں رومی، غالب اور اقبال ہیں۔

ملحدانہ اسلوب کے تحت ہم اُس ادب کو رکھیں گے جس میں مصنف اپنے سامع یا قاری کو کفر، الحاد اور رندی کی دعوت دیتا ہے۔ الحاد کے پردے میں معرفت کے نکات بھی ہو سکتے ہیں، منافقت کے خلاف بغاوت کا درس بھی ہوسکتا ہے اور سچ مچ کا الحاد بھی ہوسکتا ہے۔ تین مثالیں حافظ شیرازی، میر تقی میر اور فیض احمد فیض ہیں۔

تیسرا اسلوب وہ ہے جس کی تعریف بودلئر کے مجموعہ کلام شر کے پھول (۱۸۵۷ء) کی تمہید کے آخری مصرع میں ہوئی، ''اے منافق قاری! میری شبیہ، میرے بھائی!'' (ایلیٹ نے 'ویسٹ لینڈ' میں بھی یہ مصرع دہرایا)۔ یعنی بودلئر اور ایلیٹ کی سند پر ہم اسے منافقانہ اسلوب کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس میں شاعر خیر کی طرف بلاتا ہے نہ شر کی طرف بلکہ منافقت کو بطور اسلوب اختیار کرتا ہے (بعض شعرا نے اسے منافقت کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لیے علاج بالمثل کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش بھی کی ہے)۔ اُردو میں اس طرزِ بیان کے سرخیل پطرس بخاری اور سلیم احمد ہیں، مثلاً سلیم احمد کی نظم 'مشرق ہار گیا' کو یہ سمجھ کر نہیں پڑھا جا سکتا کہ سلیم احمد اُنھی رویوں کو فروغ دینا چاہتے تھے جنھیں نظم میں اپنی طرف منسوب کیا۔ نظم کا مفہوم پانے کے لیے ضروری ہے کہ شاعر کے اسلوب کو منافقانہ سمجھا جائے۔

اب ہم اپنے بنیادی سوال کو یوں بدل سکتے ہیں: کیا اقبال کے بعد بھی ہماری شاعری میں مومنانہ

اسلوب کی مثالیں ملتی ہیں؟ ایک مثال تو عالی کی یہی نظم ہے۔ اس کے علاوہ ایسے تمام نغمے، غزلیں اور منظومات جنہیں پاکستان میں قبولِ عام کی سند حاصل ہوئی وہ اسی قبیل میں آتے ہیں۔ کیا یہ ادبِ عالیہ ہے؟ ہرگز نہیں، اس لیے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد پست سے پست چیز بھی ملحدانہ اسلوب میں لکھی جاتی تو ترقی پسند اُسے ادب میں داخل کر لیتے، منافقانہ اسلوب میں لکھی جاتی تو اُسے حسن عسکری کے مکتب فکر کے نقاد ادب کا درجہ دیتے لیکن مومنانہ اسلوب کی اعلیٰ ترین تخلیقات بھی ادب عالیہ سے خارج تھیں کیونکہ یہ اسلوب ہی ممنوعہ قرار دے دیا گیا تھا (یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ترقی پسندوں یا حسن عسکری کے مکتب فکر والوں نے جب کبھی اقبال پر قلم اُٹھایا اقبال کے اسلوب کو ملحدانہ یا منافقانہ ثابت کرنے کی کوشش کی)!

غالباً اب یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ ''بڑے نقادوں'' نے اقبال کو کیوں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ فرق نظریے کا نہیں اسلوب کا تھا۔ اب اگر یہ عالم ہو کہ جن تخلیقی کاوشوں میں اقبال کے اثرات یعنی مومنانہ اسلوب کا شائبہ بھی گزرے اُنہیں ادب عالیہ سے باہر کر دیا جائے تو پھر یہی معلوم ہوگا جیسے ہمارے شعرا کے تخلیقی وجدان نے اقبال کا اثر قبول نہیں کیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ادب کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس پر اقبال کے اثرات واضح ہیں اور صرف اسی ادب کو قبولِ عام کی سند حاصل ہے۔ اس میں شاعری، ڈراما، انشاپردازی اور تنقید سبھی کچھ ہے مگر اُسے سرے سے ادب ہی نہیں سمجھا گیا۔ کیا واقعی ان چیزوں کا معیار پست ہے؟

نمونے کے طور پر عالی کی 'ہم مصطفوی ہیں' کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ مختصر تخلیق ہے مگر اس کے ہر مصرعے کے کئی معانی نکلتے ہیں لہٰذا اپنی تاثیر میں یہ طویل نظموں جیسی ہے اور اسلوب کے لحاظ سے حالی اور اقبال کی شاعری کا تسلسل نظر آتی ہے۔ مندرجہ ذیل نکات کو اقبال کی فکر کی روشنی میں دیکھنے کے بعد ان کی روشنی میں اقبال کی فکر میں اجتہاد بھی کیجیے اور پھر معیار کا فیصلہ خود ہی کر لیجیے۔

آج سے اڑتیس برس پہلے اسرار ناروی نے ادبِ عالیہ والوں کی ناانصافی کے خلاف کہا تھا:

سنتے رہیں کسی بھی دریدہ دہن کی بات
ہم بھی کھلے تو جوششِ گفتار دیکھنا

لیجیے اب جوششِ گفتار دیکھیے!

ابتدائیہ

ہم تا بہ اَبد سعی و تغیّر کے وَلی ہیں
ہم مصطفوی، مصطفوی، مصطفوی ہیں

دین ہمارا دینِ مکمل
استعمار ہے باطلِ ارذل
خیر ہے جِدّ و جَہدِ مسلسل
عنداللہ　　عنداللہ
اللہ اکبر، اللہ اکبر

۱- شاعر نے ''تا بہ ابد سعی و تغیر کے ولی'' ہونے کا تعلق اس بات سے جوڑا ہے کہ ''ہم مصطفوی ہیں''۔ نورِ محمدی کے بارے میں آپ کے جو بھی عقائد ہوں اُس کی روشنی میں دونوں مصرعوں کا باہمی ربط سمجھ لیجیے۔ لفظ ''ولی'' کے انتخاب کی داد دیجیے کہ نبوت کے ساتھ یہ لفظ کیا کیا معانی پیدا کر سکتا ہے۔ پھر غور کیجیے کہ نسبتِ مصطفوی سے ابد، سعی اور تغیر کے درمیان کیا تعلق ثابت ہوتا ہے اور وہ یہاں ظاہر ہو رہا ہے یا نہیں:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی

۲- ''ہم مصطفوی، مصطفوی، مصطفوی ہیں'' میں مصطفوی تین دفعہ آیا جس سے دعوے میں زور پیدا ہوتا ہے مگر اس کے بعد تین ہم قافیہ مصرعے اپنے آپ کو مصطفوی کہنے کے تین جواز پیش کرتے ہیں:

ا-　دین ہمارا دینِ مکمل یعنی اگر ہم مصطفوی نہ ہوتے تو ہمارا دین، دینِ مکمل نہ ہوتا۔

ب -　استعمار ہے باطلِ ارذل، کیونکہ آنحضرتؐ نے اسے صرف باطل قرار ہی نہیں دیا بلکہ اس پر فتح حاصل کر کے اسے عملاً باطل کر دکھایا (اکثر دوسرے الفاظ کی طرح ''باطل'' بھی بیک وقت اپنے تمام معروف معانی کے ساتھ آیا ہے۔)

ج -　جدو جہدِ مسلسل ہمارے لیے ''خیر'' اس لیے ہے کیونکہ ہم مصطفوی ہیں لہٰذا الکاسب حبیب اللّٰہ سے لے کر جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق بولنے کی فضیلت تک تمام احادیث اور اپنے جوتے کی سلائی خود کرنے سے غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے تک تمام سنتیں یاد کیجیے تو جدو جہد ''عنداللہ'' کی ساری قسمیں سامنے آ جاتی ہیں۔

۳- ابد، سعی اور تغیر پہلے مصرعے کے موضوعات تھے۔ دوسرے مصرعے میں تین دفعہ مصطفوی کی تکرار ان تینوں موضوعات کو مصطفوی ہونے سے متعلق بتا رہی ہے۔ اگلے تین مصرعے ایک ایک موضوع سے پیوستہ بھی ہیں:

☆　ابد کا تعلق دینِ مکمل سے ہے
☆　سعی کا تعلق جدو جہدِ مسلسل سے ہے
☆　استعمار کو ہٹانا وہ تغیر ہے جس کے ہم ولی ہیں

۴- ولی کا مطلب سرپرست بھی ہوتا ہے اور نبی کا جانشین بھی۔ ہم دونوں لحاظ سے ولی ہیں یعنی ''تا بہ ابد سعی وتغیر'' کے سرپرست اور آنحضرتؐ کے جانشین ہیں۔

۵- باطل کی ضد حق ہے مگر ان مصرعوں میں اس کے مقابلے پر ''خیر'' کا لفظ استعمال ہوا۔ خیر وہ ہے جو حق کے ساتھ رشتے کو قائم کرے چنانچہ ''حق'' آخری مصرعے میں آئے گا اور باطل مٹ جائے گا مگر اس سے پہلے خیر کو اپنا کام کرنا ہے اور اگلے دونوں بند اسی کا نمونہ ہیں۔

پہلا بند

سبحان اللہ، سبحان اللہ، یہ وحدت فرقانی
روحِ اُخوّت، مظہرِ قوّت، مرحمتِ رحمانی
سب کی زباں پر سب کے دِلوں میں اِک نعرہ قرآنی
اللہ اکبر، اللہ اکبر

۶- ''وحدت فرقانی'' کی ترکیب قابلِ غور ہے۔ وحدت تمام فرق مٹا دیتی ہے مگر ہماری قومی وحدت حق و باطل کا فرق قائم کرتی ہے۔ یہ انسان کے بس کی بات نہیں لہٰذا ''سبحان اللہ، سبحان اللہ...'' اس کے علاوہ فرقان، قرآن کا لقب ہے اور چونکہ یہ وحدت قرآن کی وجہ سے قائم ہوئی اس لیے بھی ''فرقانی'' ہے۔

۷- ''روحِ اخوت'' اور ''مظہرِ قوت'' میں بالترتیب باطن اور ظاہر کی طرف اشارے ہیں۔ روح اور جسم کا رشتہ جوڑنا انسان کے بس میں نہیں اس لیے ''مرحمتِ رحمانی'' ہے (خدا کے بہت سے ناموں میں سے یہاں رحمان آیا جسے پچھلے مصرع کے قافیے ''فرقان'' سے معنوی نسبت بھی ہے)۔

۸- ''سب کی زباں پر، سب کے دلوں میں...'' یہ پھر ظاہر و باطن کی اُس ہم آہنگی کی طرف اشارہ ہے جو پچھلے مصرع کا موضوع تھی۔ بیک وقت روزِ الست، مناظرِ حج اور روزِ قیامت کا تصور اُبھرتا ہے۔ جس موقع پر یہ نظم گائی جائے اُس کی عظیم الشان مماثلت ان تینوں مواقع کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے۔

۹- تینوں مصرعوں کے ہم قافیہ الفاظ فرقانی، رحمانی اور قرآنی ان مصرعوں میں مسلمانوں کے اجتماع کی کیفیات بتانے کے لیے استعمال ہوئے لیکن یہ تینوں الفاظ قرآن کے ساتھ بھی ایک خاص نسبت رکھتے ہیں۔ یوں شاعر نے لسانی اعتبار سے قاری اور قرآن کو ایک کر دکھایا ہے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

دُوسرا بند

امن کی دعوت کل عالم میں مسلک عام ہمارا
دادِ شجاعت دَورِ ستم میں، یہ بھی کام ہمارا

حق آئے باطل مٹ جائے، یہ پیغام ہمارا
اللہ اکبر، اللہ اکبر

۱۰- اسلام کے لفظی معانی کو سلامتی سے نسبت ہے لہٰذا سارے جہاں میں امن کی دعوت ہمارا مسلک عام ہے لیکن ہم سعی وتغیر کے ولی بھی ہیں اس لیے دورِ شجاعت میں دادِ ستم دینا بھی ہمارا کام ہے۔ نتیجہ دونوں باتوں کا یہ ہے کہ ''حق آئے باطل مٹ جائے''! یہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت کی طرف تلمیح ہے جو آنحضرتؐ نے فتح مکہ کے موقع پر خانہ کعبہ سے بتوں کو ہٹاتے ہوئے پڑھی تھی۔

۱۱- یہ فقرہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بھی ہمارا پیغام ہے کیونکہ شروع میں استعمار کو باطلِ ارذل قرار دیا گیا اور اب اُس کے مٹ جانے کی بشارت ہے۔ لیکن یہ اس وجہ سے بھی ہمارا پیغام ہے کیونکہ ہم مصطفوی ہیں اور آنحضرتؐ نے فتح مکہ کے موقع پر یہی پیغام دیا تھا۔

۱۲- یہ شعری تخلیق مترنم اُردو میں لکھی گئی لیکن دنیا کے کسی بھی مسلمان کے سامنے پڑھی جائے تو خواہ وہ اُردو نہ جانتا ہو تب بھی سمجھ سکتا ہے کہ اُس کے منشور کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے اور نظم کی تاثیر بھی کسی حد تک منتقل ہو سکتی ہے۔

نئے سوالات

اس پورے تجزیے کے بعد میرے ذہن میں کچھ نئے سوالات پیدا ہوئے ہیں:

۱- یہ ادب عالیہ نہیں ''ادبِ عالی'' ہی سہی لیکن اسے چونتیس برس ہونے کو آئے، ہمارے ''شاعروں'' کے تخلیقی وجدان نے اس کا اثر کیوں قبول نہیں کیا؟

۲- میں نے قریباً ایک ہزار گیت اور نظمیں، پچاس فلم اسکرپٹ اور ڈھائی سو ناول منتخب کیے ہیں جن میں سے ہر ایک کی تشریح اسی طرح کی جا سکتی ہے، ان میں ایسے معانی موجود ہیں جن سے ہمارا ادبِ عالیہ خالی ہے اور یہ تمام شاہکار پاکستان میں قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں یعنی ہر طبقے میں سب سے زیادہ مقبول یہی ہیں مگر ہمارے نقادوں نے کبھی ان پر شب خون مارنا بھی گوارا نہیں کیا۔ یہ ادبِ عالیہ نہیں تو کیا ہم اِسے ''جمہوری ادب'' کہہ سکتے ہیں؟

۳- ہم جس چیز کو ادبِ عالیہ کہتے ہیں اُس نے عشقِ رسولؐ کی اُس والہانہ کیفیت کو برقرار رکھنے کی بھی کوشش کی ہے جو سرسید احمد خاں سے اقبال کے عہد تک ہمارا قومی مزاج بن گئی تھی؟

میں نے اس مضمون میں اسرار ناروی کے ایک شعر کا حوالہ دیا۔ اُسی غزل کا آخری شعر اب میری سمجھ میں آیا ہے:

فرصت ملے جو ''لال حویلی'' کے درس سے
اِک بوریہ نشیںؐ کے بھی افکار دیکھنا